Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

Received: 28th Feb, 2025 | Accepted: 11th June, 2025 | Available Online: 30th June, 2025
Digital Object Identifier:

طاہرہ اقبال کے افسانوں میں ثقافتی تصادم کا لسانی اظہار: ایک بین الثقافتی مطالعہ

Linguistic Representation of Cultural Conflict in the Short Stories of Tahira Iqbal: An Intercultural Study

DR. GHAZAL YAQUB[1] AND DR. MUHAMMAD AMJAD[2]
[1] Teaching Research Associate, Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad, Pakistan.
[2] PhD Urdu Alumni, NUML, Islamabad, Pakistan.
Corresponding author: Ghazal Yaqub (ghazal.yaqub@iiu.edu.pk)

ABSTRACT This research investigates the lexical and cultural tensions in the short stories of Tahira Iqbal, focusing on how language operates as a site of identity, resistance, and transformation in an era of globalization. The study begins by addressing the increasing marginalization of indigenous languages and cultures in literary discourse, a trend often overshadowed by the dominance of global languages such as English. While prior scholarship has explored linguistic hybridity in postcolonial literature, there remains a gap in examining how rural and regional voices navigate globalization from within the Pakistani literary context. This paper fills that gap by examining Tahira Iqbal's unique position as a writer deeply rooted in local traditions yet responsive to global influences. Employing a qualitative textual analysis method, the study analyzes selected short stories through the lens of sociolinguistic theory and intercultural literary criticism. Findings reveal that Iqbal's hybrid linguistic style blending English with local vernaculars along with her culturally embedded storytelling, captures the complex interplay between global cultural codes and indigenous identities. Her narratives expose the socio-linguistic divide between urban elites, who increasingly embrace English, and rural communities, who preserve their mother tongues. The results underscore how Iqbal resists cultural homogenization, using language to foreground intercultural struggle and advocate for linguistic and cultural diversity. This research positions her as a critical voice in contemporary literature, challenging dominant narratives of globalization while reaffirming the value of local identity in literary expression.

Keywords Cultural, Globalization, Linguistic, Cultural diversity, Homogenization.

عصری اردو ادب کی ایک ممتاز شخصیت طاہرہ اقبال نے پاکستانی ثقافت کے مختلف رنگوں کو اپنے افسانوں میں بُنا ہے۔ اُن کی مختصر کہانیاں پاکستانی معاشرے کی کثیر جہتی ثقافتی حرکیات کی عکاسی کرتی ہیں، خاص طور پر پنجاب کے دیہی مناظر پر زور دیتی ہیں۔ اپنی باریک بینی کے ذریعے، طاہرہ اقبال نے مقامی روایات، رسوم ورواج اور ان موروثی تنازعات کو اپنی گرفت میں لے کر ان روایات کو جدیدیت سے جوڑ دیا ہے۔ طاہر اقبال نے ثقافتی تنازعات کی تصویر کشی میں زبان کو ایک اہم ٹول کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ اپنے

This work is licensed under a **Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)**

کرداروں اور ترتیبات کو صداقت فراہم کرنے کے لیے علاقائی بولیوں اور مقامی بول چال کا استعمال کرتی ہیں۔ یہ لسانی انتخاب نہ صرف بیانیہ کو تقویت بخشتا ہے بلکہ مقامی روایات اور بیرونی اثرات کے درمیان سماجی و ثقافتی تناؤ کو بھی اجاگر کرتا ہے۔

لسانی بشریات کا تصور طاہرہ اقبال کی تخلیقات میں واضح ہے، جہاں زبان ثقافتی اظہار اور شناخت کی تشکیل کے لیے ایک راستے کا انتخاب کرتی ہے۔ ان کے افسانوں میں مقامی بولیوں اور ثقافتی علامتوں کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے اس طرح وہ اپنے قارئین کو ایک عمیق تجربہ فراہم کرنے میں کامیاب دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ طاہرہ اقبال کے افسانوں میں مقامی ثقافت کے موضوعات اور عالمگیریت کے درمیان ثقافتی شناخت کو برقرار رکھنے کے چیلنجوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے کردار جدید معاشرتی تبدیلیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے روایتی اقدار کو برقرار رکھنے کی پیچیدگیوں کو بیان کرتے ہیں، جو عصری ادب میں ثقافتی تحفظ اور موافقت پر وسیع تر گفتگو کی عکاسی کرتے ہیں۔ جنوبی ایشائی ادب کے وسیع تر تناظر میں، زبان اور ثقافت کے درمیان تعامل ایک بار بار چلنے والا موضوع ہے۔ مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ایشائی مختصر کہانیوں میں ذولسانی اور کوڈ کی تبدیلی ثقافتی عناصر کی عکاسی کو بڑھاتی ہے، جس سے قارئین کرداروں کے تجربات کے ساتھ مزید گہرائی سے مشغول ہوتے ہیں۔ یہ تکنیک طاہرہ اقبال کے نقطہ نظر سے واضح ہوتی ہے، کیونکہ وہ اپنے افسانوں کی پیش کش میں مقامی لسانی عناصر کو بغیر کسی رکاوٹ کے مربوط کرتی ہیں۔

طاہرہ اقبال کے افسانے عالمگیریت کے تناظر میں لسانی اور ثقافتی تناؤ کی متحرک تحقیق کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے افسانون میں زبان محض ابلاغ کا وسیلہ نہیں بلکہ شناخت، مزاحمت اور تبدیلی کی ایک مضبوط علامت کے طور پر ابھرتی ہے۔ اشرافیہ اور دیہی یا پسماندہ طبقات کے مابین تفریق کو نمایاں کرتے ہوئے، ان کے افسانے ایک گہرے ثقافتی اور شناختی بحران کو آشکار کرتی ہیں جو صرف الفاظ اور قواعد تک محدود نہیں رہتا۔ انگریزی اور مقامی زبانوں کا شعوری امتزاج ایک ایسا ہائبرڈ بیانیہ تشکیل دیتا ہے جو مقامی روایات اور عالمی اقدار کے درمیان موجود کشمکش کو نمایاں کرتا ہے۔ اس طرح ان کا تخلیقی عمل ایک ادبی میدانِ کارزار کی صورت اختیار کرلیتا ہے، جہاں عالمگیریت کی ہم آہنگ قوتوں کو فعال انداز میں چیلنج کیا جاتا ہے۔

عصری اردو ادب میں ایک نمایاں آواز کے طور پر، طاہرہ اقبال پاکستان کی پیچیدہ ثقافتی ساخت کو فکشن کے ذریعے بُننے کی کوشش کرتی ہیں، بالخصوص پنجاب کے دیہی مناظر کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی کہانیاں ثقافتی حرکیات سے لبریز ہیں جو روایت اور جدیدیت کے باہمی تعامل کو کامیابی سے گرفت میں لیتی ہیں۔ مقامی رسوم ورواج اور سماجی ڈھانچوں کے حوالے سے ان کی گہری حساسیت ان کے تخلیقی عمل کو نیا زاویہ عطا کرتی ہے، جس کے ذریعے وہ اندرونی اور بیرونی تنازعات کو اجاگر کرتی ہیں جو جدید پاکستانی شناخت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی تناظر انہیں دیہی روایات کو جامد مظاہر کے بجائے ارتقائی ثقافتی عناصر کے طور پر پیش کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے، جو جدید اثرات کے ساتھ ایک مسلسل مکالمے میں مصروف ہیں۔

بین الثقافتی ادب میں ثقافتی تصادم ایک اہم موضوع کے طور پر نمایاں ہوتا ہے، جو مقامی روایات اور بیرونی ثقافتی اثرات کے درمیان پائے جانے والے تناؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ عنصر طاہرہ اقبال جیسی افسانہ نگاروں کے تخلیقی ادب میں بطور خاص نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں وہ کردار سامنے آتے ہیں جو اقدار کے تصادم، لسانی تغیرات، اور بیرونی طور پر مسلط کردہ شناختوں کے باعث گہرے

نفسیاتی اور سماجی کشمکش کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ صورتحال اس امر کی عکاسی کرتی ہے کہ ذاتی اور اجتماعی شناختیں کس طرح موروثی ثقافت اور جدید تبدیلیوں کے درمیان الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ ثقافتی تصادم محض فکری یا عملی سطح پر محدود نہیں بلکہ اس کا اظہار زبان اور بیانیہ کی سطح پر بھی شدت سے محسوس کیا جاتا ہے۔

محسن حامد کے معروف ناول The Reluctant Fundamentalist میں ثقافتی تصادم کو مؤثر طور پر پیش کیا گیا ہے، جہاں مرکزی کردار چنگیز اپنی دوہری شناخت کے بحران کا سامنا کرتا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> "The novel contrasts Changez's dynamic, sophisticated character with the static, impoverished representation of Pakistan often portrayed through Western lenses, as seen in the depiction of Lahore as a city stuck in time (Hamid, 2007, p. 5). Changez defies these stereotypes by showcasing his intelligence, ambition, and deep knowledge of both Eastern and Western cultures, which enable him to succeed academically at Princeton and professionally at Underwood Samson (Hamid, 2007, p. 11; p. 121). His ability to navigate American society while maintaining his cultural identity underscores his resistance to imposed stereotypes and reflects the complexities of cultural integration and the lingering effects of colonization"(۱)

یہ اقتباس اس بات کی دلیل فراہم کرتا ہے کہ ثقافتی شناخت نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی سیاق میں ایک مزاحمتی مقام اختیار کر لیتی ہے۔ اسی نوع کی مزاحمت طاہرہ اقبال کے کرداروں میں بھی دکھائی دیتی ہے، جو سماج کی غالب اقدار، خصوصاً پدرانہ اور مغربی اصولوں پر مبنی توقعات، کو چیلنج کرتے ہیں۔ یہ کردار ثقافتی جڑوں سے وابستگی اور داخلی مضبوطی کے ذریعے اپنی اصل شناخت کی بازیافت اور توثیق کرتے ہیں۔ لسانی سطح پر بھی ثقافتی تصادم کا اظہار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ عبدالستار ملک کے مطابق:

> "بولنے کے بہت سے طریقے ہیں اور بولنے کا ہر طریقہ ایک تنوع ہے۔ مثلاً مختلف لہجے اور بولیاں اس طرح کی تفریق کی بنیاد سماجی، تاریخی، مقامی یا ان سب کا مجموعہ ہو سکتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ کسی بھی زبان میں تنوع اور تغیر کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں"(۲)

یہ اقتباس اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ زبان نہ صرف ایک ابلاغی ذریعہ ہے بلکہ یہ سماجی، تاریخی اور علاقائی شناختوں کی علامت بھی ہے۔ طاہرہ اقبال کی کہانیوں میں مقامی لہجوں، محاورات، اور عوامی اندازِ گفتگو کا استعمال نہ صرف ان کے افسانوں کی حقیقت نگاری کو تقویت دیتا ہے بلکہ یہ غالب لسانی و ثقافتی بیانیے کے خلاف ایک تہذیبی مزاحمت کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ وہ زبان کی معیاری اور مقتدر شکل کو چیلنج کرتے ہوئے دیہی اور علاقائی آوازوں کو ادبی منظرنامے پر ایک باوقار مقام عطا کرتی ہیں، جس سے زبان خود ایک ثقافتی میدانِ کارزار بن جاتی ہے۔ موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر بھی طاہرہ اقبال کے تخلیقی متون اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ ثقافتی تصادم محض کرداروں کی داخلی کشمکش تک محدود نہیں، بلکہ یہ بیانیے، زبان، اور شناخت کی بُنت میں بھی سرایت کر جاتا

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

ہے۔ ان کا ادب نہ صرف مابعد نو آبادیاتی سیاق میں شناخت کے سوالات کو اجاگر کرتا ہے بلکہ یہ بین الثقافتی مباحث کو وسعت دینے میں بھی کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ زبان ان کے تخلیقی عمل میں بیانیہ کی ایک کلیدی تکنیک کے طور پر نمایاں ہوتی ہے، جسے وہ ثقافتی تصادمات کی مؤثر عکاسی کے لیے شعوری طور پر بروئے کار لاتی ہیں۔ طاہرہ اقبال کا علاقائی لہجوں اور مقامی بول چال کے اظہارات کا استعمال ان کے کرداروں میں نہ صرف صداقت پیدا کرتا ہے بلکہ انہیں ان کے سماجی سیاق وسباق میں مضبوطی سے پیوست بھی کرتا ہے۔ ان کے لسانی انتخاب صرف حقیقت نگاری تک محدود نہیں بلکہ وہ مقامی و عالمی تناؤ، گہرے ثقافتی رویّوں اور بدلتی ہوئی خارجی دنیا کے درمیان ربط و تصادم کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ ان کی لسانی حکمت عملی اس ادراک کی مظہر ہے کہ زبان نہ صرف ایک ثقافتی خزانہ ہے بلکہ جدوجہد کا ایک میدان بھی ہے۔

جنوبی ایشیائی ادب کے وسیع تناظر میں، طاہرہ اقبال کی بیانیہ تکنیک اُن ابھرتے ہوئے ادبی رجحانات سے ہم آہنگ نظر آتی ہے جو ثقافتی نمائندگی کے ذرائع کے طور پر دولسانیت اور کوڈ سوئچنگ کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا تخلیقی عمل یہ ظاہر کرتا ہے کہ زبانوں کا باہمی تعامل کس طرح ثقافتی شناخت اور انفرادیت کے ساتھ قاری کی وابستگی کو گہرا کرتا ہے۔ یہ تکنیک کرداروں کے داخلی کشمکش اور سماجی دباؤ کو دریافت کرنے میں مدد دیتی ہیں، خاص طور پر جب وہ ایک عالمی تناظر میں اپنی روایتی اقدار کے تحفظ کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی کہانیوں کو مقامی علامات اور علاقائی بولیوں سے آراستہ کرکے، طاہرہ اقبال نہ صرف مؤثر فکشن تخلیق کرتی ہیں بلکہ وہ معاصر ادب میں ثقافتی تنوع کے تحفظ اور اس کی قدردانی میں بھی بھرپور کردار ادا کرتی ہیں۔

اردو زبان کی ساخت اور لغوی تنوع اس کی ارتقائی تاریخ کا مظہر ہے، جو اسے دنیا کی دیگر مخلوط زبانوں کے ہم پلہ قرار دیتا ہے۔ تحقیق سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان نے اپنے آغاز ہی سے دیگر زبانوں سے الفاظ اخذ کرنے کا عمل جاری رکھا، جو نہ صرف اس کی لسانی وسعت کا ثبوت ہے بلکہ اس کے زندہ اور ترقی پذیر ہونے کی دلیل بھی ہے۔ فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت اور بعد ازاں انگریزی سے مستعار لیے گئے الفاظ اردو کے لغوی ذخیرے کو وسیع تر بناتے ہیں۔ یہ الفاظ صرف لغت کی سطح پر شامل نہیں ہوئے بلکہ اردو کے فکری، تہذیبی اور ادبی اظہاریہ کا حصہ بن کر اس کی معنوی ساخت کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ یوں اردو زبان کی موجودہ صورت اس کے تاریخی، جغرافیائی اور سماجی تعاملات کا نتیجہ ہے، جو اسے ایک زندہ، ہمہ گیر اور مخلوط زبان کے طور پر شناخت فراہم کرتی ہے۔

> "اگرچہ دنیا کی دیگر مخلوط زبانوں کی طرح اردو میں بھی کئی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ وہ زبانیں جو مخلوط نہیں ان کا خزانہ بھی مال غیر سے خالی نہیں ہوتا"[۳]

طاہرہ اقبال کی تحریروں میں اردو زبان کے لغوی تنوع اور مخلوط ساخت کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے، جہاں مختلف زبانوں سے مستعار الفاظ نہ صرف اظہار کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ ثقافتی تصادم اور تہذیبی کشمکش کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ وہ ایسے الفاظ اور تعبیرات کو استعمال میں لاتی ہیں جو قاری کو مختلف تہذیبوں کی باہمی آویزش کا احساس دلاتے ہیں۔ اس طرح ان کی تحریر اردو زبان کی اس ارتقائی شناخت کو اجاگر کرتی ہے جس میں لسانی میل جول، تاریخی اثرات اور سماجی تنوع پوری شدت سے منعکس ہوتا ہے۔

آخر میں، طاہرہ اقبال کے افسانے زبان کے استعمال کے ذریعے ثقافتی تنازعات کی گہرائی سے تحقیق کرتی ہیں۔ ان کا کام نہ

صرف پاکستان کے لسانی اور ثقافتی ورثے کی حفاظت کرتا ہے، بلکہ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں ثقافتی شناخت کی ابھرتی ہوئی تبدیلیوں کے بارے میں بھی اہم بصیرت فراہم کرتا ہے۔ طاہرہ اقبال کے افسانے لسانی نمائندگی سے بھرپور ہیں۔ اُن کے افسانے علاقائی بولیوں، مقامی بول چال اور ثقافتی تاثرات کے استعمال کے ذریعے، وہ دیہی اور شہری ماحول میں گہرے سماجی و ثقافتی تناؤ کو ظاہر کرتی ہیں۔ درج ذیل تجزیہ کا مقصد ان لسانی انتخابات کو ان کے افسانوں میں ثقافتی تصادم کے وسیع موضوعات سے جوڑنا ہے۔ اس ضمن میں ان کے افسانے مِس فٹ سے ایک اقتباس دیکھئیے:

> "وہ ناپ ناپ پکارتی سنار کی دکان کا طواف کرنے لگی۔ چونکہ حقیقتیں اس پر الہام کی طرح منکشف ہوئی تھیں یہ احساس تمام تر شدائد کے ساتھ اس پر برسا کہ اس نے زندگی بناناپ کے گزار دی۔ یعنی مس فٹ، مس میچ، مس فٹ دراصل زندگی ہرگز نہیں ہوتی، محض جبر ہوتا ہے، بے بسی ہوتی ہے، سمجھوتہ ہوتا ہے۔ تین بچے، چودہ برس کی ازدواجی زندگی، مس میچ اور مس فٹ زندگی کے ناگوار نتائج، جیسے سب کچھ محض خواب تھا"(۴)

اس اقتباس کے تناظر میں مس فٹ کی اصطلاح کا تجزیہ کریں تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ذاتی شناخت اور سماجی توقعات کے درمیان اندرونی کشمکش کو اجاگر کرتی ہے۔ اس حوالے میں، کردار اس احساس کے ساتھ جکڑا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی جو کہ ایک ناکام شادی اور بچوں کے بوجھ سے نشان زدہ ہے جو اس کے ذاتی خوابوں کی تکمیل کی بجائے ایک سمجھوتے پر مبنی ہے۔ "مس فٹ" کا لسانی انتخاب فرد کی خواہشات اور معاشرتی اصولوں کی طرف سے عائد رکاوٹوں کے درمیان اختلاف کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ اصطلاح روایتی صنفی کرداروں اور خود کے ابھرتے ہوئے احساس کے درمیان گہری ثقافتی کشمکش کو اجاگر کرتی ہے۔

پنجاب کے متنوع ثقافتی تانے بانے میں، ایک منفرد اور گہرا سماجی کردار نسل در نسل محفوظ رہا ہے، اور وہ ہے وِچولن کا کردار۔ وچولن ایک اصطلاح ہے جو پنجابی معاشرے میں سرایت کرتی ہے، اور اس سے مراد وہ عورت ہے جو دو خاندانوں کے درمیان اہم ثالثی کا کردار ادا کرتی ہے، خاص طور پر شادی کے مذاکرات، خاندانی تعلقات، اور سماجی و ثقافتی پیغامات کی منتقلی کے تناظر میں۔ یہ رواج پنجاب کے دیہی ثقافتی تانے بانے میں گہری جڑیں رکھتا ہے اور جدید دور میں بھی اس کی اہمیت برقرار ہے۔

وچولن کا کردار نہ صرف پیغامات کی ترسیل تک محدود ہوتا ہے بلکہ یہ خاندانوں کے درمیان روابط قائم کرنے اور ان کی بنیاد کو مستحکم کرنے کے عمل میں بھی اہم ہے۔ تاریخی طور پر، پنجاب میں طے شدہ شادیاں ایک عام رواج تھیں اور اب بھی کچھ علاقوں میں یہ معمول ہے۔ وچولن وہ شخصیت ہے جو دولہا کے خاندان کے پیغامات، دلچسپیاں، یا خدشات دلہن کے خاندان تک پہنچاتی ہے۔ اس کا کردار نہ صرف ابتدائی تعارف کو آسان بناتا ہے بلکہ دونوں خاندانوں کے درمیان ہر طرح کی بات چیت کی وضاحت اور اس کی تکمیل میں مدد فراہم کرتا ہے۔

وچولن کا کردار محض پیغام رسانی سے بڑھ کر ایک اہم سماجی و ثقافتی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ پنجابی معاشرتی ڈھانچے کا ایک لازمی حصہ ہے، جو روایات، احترام، اور ثقافتی گفت و شنید کی علامت ہے۔ پنجابی معاشرت میں جہاں خاندانی رشتہ داری اور برادری کے تعلقات

کی بڑی اہمیت ہے، وچولن ان تعلقات کی تعمیر اور توسیع میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اس کا کردار خاندانی اقدار کو آگے بڑھانے اور کمیونٹی کی ہم آہنگی کو برقرار رکھنے میں اہم ہوتا ہے۔ تاریخی طور پر، وچولن کو ایک معزز بزرگ یا قابل اعتماد شخصیت کے طور پر جانا جاتا تھا، جس کا فیصلہ خاندانی تعلقات کے انتظام میں اہم سمجھا جاتا تھا۔ دیہی علاقوں میں جہاں روابط اور مواصلات زیادہ ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں، وچولن نے اہم سماجی واقعات جیسے کہ شادیوں پر بات چیت کرنے کے لیے ایک اہم چینل کے طور پر کام کیا۔ اس عمل نے خاندانوں کو سماجی حیثیت پر قابو پانے کے مواقع فراہم کیے اور انہیں اپنے معاشرتی اتحادوں کو بہتر طور پر منظم کرنے کی اجازت دی۔ وچولن کا کردار صرف پیغامات کی ترسیل تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ ثقافتی اقدار کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ شادی کے انتظامات کے دوران پیغامات کا تبادلہ ایک گہری ثقافتی نوعیت کا حامل عمل ہے۔ وچولن نہ صرف پیغامات کی ترسیل کو یقینی بناتی ہے، بلکہ وہ ثقافتی روایات، جیسے بزرگوں کی عزت اور خاندانی وقار، کی حفاظت بھی کرتی ہے۔

جب دولہے کے خاندان کی جانب سے وچولن کا انتخاب کیا جاتا ہے، تو اس کا مقصد نہ صرف بات چیت شروع کرنا ہوتا ہے بلکہ دلہن کے خاندان کے ساتھ پہلی ملاقات میں ایک رسمی حیثیت پیدا کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس کی موجودگی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں خاندانوں کے درمیان کوئی اہم فیصلہ یا بات چیت ہو رہی ہے۔ اس کے بعد وچولن دونوں خاندانوں کے درمیان پیغامات کی ترسیل کا عمل جاری رکھتی ہے، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ تمام معلومات اور فیصلے بغیر کسی غلط فہمی کے پہنچیں۔ جہاں اس کردار کی ایک ثقافتی اہمیت ہے، وہیں پر اس کردار کے کچھ منفی پہلو بھی ہیں۔ ان پہلوؤں کو طاہرہ اقبال نے اپنے افسانے میں اجاگر کیا ہے، ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"گلزاری سنا ہے کہ تو پرے گاؤں کی وچولن ہے۔"

راجہ راز کی کشادہ پیشانی پر بناجال اُس کے تاثرات کو آنکنے لگا۔

"سارے گاؤں کی نہیں راجہ جی۔ بس نئے نئے جوان ہوئے چھوکرے چھوکریوں کے ٹانکے بھراتی ہے۔"

"پررررر۔۔۔۔لوگ کہتے ہیں گنڈ 'اپنے ہی دھاگے کی لگاتی ہے۔"

"ہٹ پرے آدو'سدا کا وادو'مچھ واڈو"(۵)

اس اقتباس میں طاہر اقبال نے روایتی معاشرتی ڈھانچے میں وچولن کے کردار کی منفی جہت کو نہایت مؤثر انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ راجہ راز اور گلزاری کے مابین مکالمے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وچولن کی سرگرمیاں محض قابلِ احترام رشتہ کرانے تک محدود نہیں رہیں بلکہ اخلاقی طور پر مشتبہ دائرے تک پھیل گئی ہیں۔ فقرہ "گنڈ "استعاراتی طور پر اس بات کی علامت ہے وچولن اب غیر جانب دار سہولت کار کے بجائے ذاتی مفادات کے تحت رشتوں میں مداخلت اور ہیرا پھیری کر رہی ہے۔ "نوزائیدہ لڑکے اور لڑکیوں" کی شمولیت اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ معاشرتی خدمت کے مقدس لبادے میں کمزور طبقات کے استحصال کا عمل جاری ہے۔ اس طرح وچولن ثقافتی اداروں کو ذاتی منفعت کے لیے استعمال کرتے ہوئے سماجی ہم آہنگی کے بجائے معاشرتی انحطاط کا سبب بن رہی ہے۔ طاہر اقبال کی یہ مؤثر تصویر کشی قاری کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اس روایت کے کردار کا تنقیدی جائزہ لے اور یہ سمجھے کہ اگر اخلاقی

اقدار کو برقرار نہ رکھا جائے تو کس طرح وقت کے ساتھ روایتی رسم و رواج بھی بگاڑ کا شکار ہو سکتے ہیں۔ یہ کردار دیہی رسم و رواج اور شہری حساسیت کے درمیان ثقافتی تصادم کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ کہانی کے تناظر میں راجاجی کا کردار ایک شہوانی خواہشات میں گھرا ہوا فرد ہے، جو وچولن کے ساتھ مل کر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا استحصال کرتا ہے۔ وچولن، جو روایتی پنجابی ثقافت میں شادی بیاہ کے معزز اور قابل احترام معاملات میں سہولت کار کا کردار ادا کرتی تھی، یہاں دلال کے روپ میں سامنے آتی ہے جو ذاتی مفادات اور مالی فوائد کے حصول کے لیے اپنی حیثیت کا غلط استعمال کرتی ہے۔ راجاجی اپنی طاقت اور حیثیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وچولن کے توسط سے کمزور اور ناتجربہ کار نوجوانوں تک رسائی حاصل کرتا ہے، جب کہ وچولن بدلے میں اس استحصالی عمل سے مالی نفع حاصل کرتی ہے۔ اس طرح، کہانی ثقافتی روایت میں موجود ایک معزز پیشے کے زوال کو نمایاں کرتی ہے، جہاں اخلاقی اقدار پس پشت چلی جاتی ہیں اور ذاتی مفادات غالب آجاتے ہیں۔ راوی ایک تہہ دار تنقید کے ذریعے اس بات کو اجاگر کرتا ہے کہ جب سماجی عدم مساوات، طاقت کا ناجائز استعمال اور اخلاقی انحطاط ثقافتی اداروں میں در آتے ہیں تو وہ ادارے اپنی اصل معنویت اور تقدس کھو بیٹھتے ہیں۔ یوں کہانی نہ صرف ایک مخصوص کردار کی اخلاقی پستی کو بے نقاب کرتی ہے بلکہ پورے سماجی ڈھانچے میں موجود خرابیوں کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ اس ساری صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> "تو دکھا دیتے ہیں راجہ جی دیکھنے کے پیسے تھوری لگتے ہیں۔ پر کوئی نشانی کوئی مندری کا چھلا کوئی نک دا کوکا۔"(۶)

کہانی میں وچولن کا کردار صرف مالی فائدے یا نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے جسمانی استحصال تک محدود نہیں رہتا، بلکہ وہ ان سے ذاتی خدمات بھی حاصل کرتی ہے۔ اس طرح وچولن ایک سہولت کار سے بڑھ کر ایک قابض قوت بن جاتی ہے، جو اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے کمزور طبقات سے اپنی ضروریات پوری کراتی ہے۔ یہ رویہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جب ثقافتی اداروں پر اخلاقی زوال چھا جاتا ہے تو وہ استحصال اور خود غرضی کے اڈے بن جاتے ہیں۔

> "نکھٹو بے فیضیو کنگلیو! میں سَر پیڑ سے مرے جاتی ہوں۔ اتنی توفیق نہیں کہ دو انڈے لا کر اُبال دو اور دودھ میں پتی ڈال دو۔"(۷)

درج بالا اقتباس میں وچولن کی نوجوانوں کے ساتھ بے تکلفی یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ان کو استعمال کرتی ہے۔ نوجوانوں کا اس سب کے لیے اسے دستیاب ہونا اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ اپنی اداؤں سے انہیں لبھاتی ہے جو اس معاشرے یا اس کردار کی اخلاقی گراوٹ کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کردار کے مزاج برہم ہونے پر اس کا نوجوانوں کے ساتھ گفتگو کا انداز ملاحظہ کریں:

> "ہٹو پرے دفع ہو جاؤ کیا لینے آتے ہو، جاؤ اپنی ماؤں کے گوڈے سے لگ کر بیٹھو۔"(۸)

اس اقتباس میں وہ نوجوانوں پر طنز بھی کر رہی ہے کہ تم یہاں کیا لینے آتے ہو، تمہاری ابھی عمر ماں کے گوڈے کے ساتھ لگ کر بیٹھنے کی ہے۔ لسانی اعتبار سے مصنفہ نے ایک ہی لفظ (وچولن) میں پوری ثقافتی حالت کو سمیٹ کر معنی کا ایک نہایت مؤثر اور جامع

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

اظہار پیش کیا ہے۔ یہ اسلوب قاری کو طویل توضیح کے بغیر معاشرتی حقیقت کی گہرائی تک رسائی فراہم کرتا ہے۔ مصنف کا منتخب کردہ لفظ ایک لسانی علامت کی حیثیت رکھتا ہے، جو مفہوم کی تہہ دار سطحوں، تاریخی سیاق و سباق، اور جذباتی شدت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ لفظ محض کسی فرد کے رویے کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ پورے معاشرے کی اقدار، تضادات، اور اخلاقی سمت کی عکاسی کرتا ہے۔ ایسی لسانی اختصار پسندی ادب میں بیانیہ کو محض بیان سے آگے بڑھا کر ثقافتی تنقید کے دائرے میں داخل کر دیتی ہے۔ ایک لفظ پورے سماج کے لیے آئینہ بن جاتا ہے، جو اس کی منافقت، اخلاقی زوال یا ممکنہ تبدیلی کو آشکار کرتا ہے۔ یہ اسلوب اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب میں زبان محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ تہذیبی جوہر کو نہایت سادہ، مگر پر اثر انداز میں کشید کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہے۔

مقامی ثقافتی تناظر میں واکنگ ٹریک، سڈن ڈیتھ، سلیپنگ بیوٹی اور ٹرانسپلانٹیشن جیسے انگریزی تراکیب کا استعمال گلوبلائزیشن سے متاثرہ ایک اہم لسانی و ثقافتی تبدیلی کی علامت ہے۔ یہ تراکیب محض لغوی مسعاریت نہیں بلکہ اس وسیع تر رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں جس کے تحت عالمی (بالخصوص مغربی) لغت غیر مغربی معاشروں کی روزمرہ زبان میں سرایت کر چکی ہے۔ انگریزی زبان سے وابستہ علامتی طاقت اور سماجی وقار ان اصطلاحات کو مقامی زبان پر فوقیت عطا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں مقامی اصطلاحات رفتہ رفتہ پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ یہ لسانی ادغام اس عمل کو آشکار کرتا ہے جس کے تحت عالمی ثقافتی اثرات مقامی شناختوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر نئے سانچوں میں ڈھال رہے ہیں۔ تحقیقی تناظر میں، اس نوع کے لسانی شواہد اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ انگریزی کس طرح ایک بالادست عالمی زبان کے طور پر ابھری ہے، بالخصوص نوآبادیاتی پس منظر رکھنے والے یا ترقی پذیر معاشروں میں۔ مصنف انگریزی زبان کے استعمال کے ذریعے اس نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ زبان محض ابلاغ کا وسیلہ نہیں، بلکہ جدیدیت، تعلیم، اور سماجی و اقتصادی ترقی کی علامت بن چکی ہے۔ یہی علامتی حیثیت مقامی لسانی و ثقافتی روایات کے بتدریج زوال یا ان کی نئی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ روزمرہ ثقافتی حوالوں میں انگریزی اصطلاحات کی موجودگی درحقیقت عالمی اور مقامی عناصر کے درمیان جاری پیچیدہ اور تہہ دار تعامل کا مظہر ہے، جو اس بات کا متقاضی ہے کہ زبان کے توسط سے وقوع پذیر اس ثقافتی تغیر کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔

ان انگریزی اصطلاحات نے مقامی ثقافتی بیانیے میں دخل اندازی کی ہے، جو نہ صرف لسانی مستعاریت کے طور پر بلکہ مقامی اظہار پر عالمی اثر و رسوخ کی مضبوط علامت کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

> "کل شام چھ بج کر اڑتالیس منٹ پر جناح پارک کے واکنگ ٹریک پر زبردست دھماکہ ہوا، کئی
> کلووزنی ٹائم بم پھولوں کے کنج میں چھپا کر رکھا گیا تھا۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ کئی فٹ گہرے
> گڑھے بن گئے اور انسانی جسموں کے پرخچے اُڑ گئے۔"(۹)

مصنفہ نے جدید شہری اصطلاحات کا استعمال رکھتے ہوئے واکنگ ٹریک پر ہونے والے بم دھماکے کے واقعے کو بیان کیا ہے۔ لسانی اظہار کے ساتھ ساتھ یہ اقتباس پاکستان میں ثقافتی اور سیاسی عدم استحکام کی حقیقت کے درمیاں تصادم کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ واکنگ ٹریک کا استعمال جدید انفراسٹرکچر اور عوامی مقامات سے منسلک انگریزی الفاظ کے استعمال کو اجاگر کرنے کے ساتھ عالمگیریت کے اثرات کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

"یہ بھی کوئی بات ہے بھلا، نیوز بلیٹن دیکھتے وقت بھی روؤ۔ چلو ہیرو ہیروئن کی ٹریجڈی پر تو رونے کا جواز بنتا ہے لیکن یہ خبریں بھی آج کل کسی ٹریجک فلم کے اینڈ سے کم نہیں ہیں"(۱۰)

درج بالا اقتباس اس بات کو نمایاں کرتا ہے کہ عالمگیریت کے اثرات نے نہ صرف ہمارے طرزِ زندگی کو بلکہ ہمارے جذبات کے اظہار اور روزمرہ تجربات کی ترجمانی کے انداز کو بھی یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ "نیوز بلیٹن"، "ہیرو" اور "ہیروئن" جیسے الفاظ، جو دراصل انگریزی زبان سے ماخوذ ہیں، اردو سمیت کئی مقامی زبانوں میں روزمرہ گفتگو کا حصہ بن چکے ہیں۔ مقامی تاثرات کے ساتھ انگریزی اصطلاحات کا یہ امتزاج ذرائع ابلاغ کے ذریعے عالمی ثقافت کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کی عکاسی کرتا ہے۔ "نیوز بلیٹن دیکھتے ہوئے رونا" اور اس کیفیت کا ایک "افسوسناک فلم" کے جذباتی اختتام سے موازنہ کرنا اس بات کا مظہر ہے کہ عالمی سینما اور میڈیا کی زبان نے جذبات، غم اور بیانیہ کی مقامی تفہیم کو نئی صورت دے دی ہے۔ جو جذبات کبھی روایتی استعاروں یا ثقافتی محاوروں کے ذریعے بیان کیے جاتے تھے، اب انہیں مغربی زاویۂ نگاہ سے دیکھا اور پیش کیا جارہا ہے۔ زبان کا یہ بدلتا ہوا استعمال ایک گہری ثقافتی تبدیلی کی نشان دہی کرتا ہے۔ یعنی بین الاقوامی فریم ورک میں مقامی تہذیبی حساسیت کا ضم ہو جانا۔ جیسے جیسے انگریزی اصطلاحات ہماری روزمرہ زبان میں رائج ہو رہی ہیں، ویسے ویسے مقامی ثقافتی علامتیں یا تو بدل رہی ہیں یا مٹتی جارہی ہیں۔ اب غم یا المیے کے اظہار کے لیے مقامی ادبی حوالوں کے بجائے، لوگ عالمی استعاروں جیسے "ہیرو" اور "افسوسناک فلم" پر انحصار کرنے لگے ہیں۔ یہ تبدیلی مقامی اور عالمی ثقافتوں کے درمیان مسلسل تصادم کو ظاہر کرتی ہے، جہاں ایک معاشرے کے جذباتی اظہار کی زبان آہستہ آہستہ نئے مفاہیم اختیار کر رہی ہے۔ عالمگیریت بلاشبہ رابطے کے ذرائع کو فروغ دیتی ہے اور ثقافتی افق کو وسعت دیتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ مقامی تہذیبی شناختیں ایک مشترک عالمی ثقافت میں مدغم ہو جائیں۔ یوں، یہ اقتباس نہ صرف زبان کے بدلتے ہوئے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اس کے پس منظر میں جاری ثقافتی اور جذباتی تبدیلیوں کا آئینہ بھی پیش کرتا ہے۔ اس حوالے سے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"دل، جگر، گردے کچھ بھی باغی سا بدن سے نکال دینے کی صورت میں ٹرانسپلانٹیشن ضروری ہوتی ہے۔ یعنی ایسا ہی ایک عضو پہلے کی جگہ پر لگنا چاہیے، ورنہ موت۔۔۔۔ اور جب جلد اور ہڈیوں کے اندر کسی باغی اعضاء کی پلانٹیشن ممکن نہ رہے، تو پھر اُسی بیمار عضو کے ساتھ ہی جینا ہوتا ہے۔"(۱۱)

"ٹرانسپلانٹیشن" اور "پلانٹیشن" جیسے الفاظ، جو انگریزی زبان سے ماخوذ ہیں، اب غیر انگریزی بولنے والے معاشروں میں بھی مستعمل اور معیاری اصطلاحات بن چکے ہیں۔ یہ امر طب کے شعبے میں عالمگیریت کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح کی اصطلاحات کا روزمرہ زبان میں شامل ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ سائنسی تحقیق، عالمی طبی مواصلات اور تعلیمی تبادلوں نے طبی علم، طریقۂ علاج اور زبان کو سرحدوں سے آزاد کر دیا ہے۔ اعضاء کی پیوند کاری جیسے تصورات، جو کبھی صرف ترقی یافتہ ممالک تک محدود تھے، اب دنیا بھر میں نہ صرف جانے پہچانے جاتے ہیں بلکہ ان پر عمل بھی کیا جارہا ہے اور ساتھ ہی وہ مخصوص زبان اور فکری پس منظر بھی اپنا اثر دکھا رہا ہے جس سے یہ تصورات جنم لیتے ہیں۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

اس تناظر میں دیکھا جائے تو عالمگیریت نے نہ صرف جدید طبی ٹیکنالوجی تک رسائی کو آسان بنایا ہے بلکہ انسانی جسم، صحت اور بیماری کے بارے میں اظہار کے طریقوں کو بھی نئی جہت دی ہے۔ لفظ "ٹرانسپلانٹیشن" صرف ایک طبی عمل کی نشاندہی نہیں کرتا، بلکہ یہ ایک ایسے عالمی طبی نظریے کا حصہ ہے جو جدید سائنس اور بین الاقوامی نظامِ صحت کی سوچ سے تشکیل پایا ہے۔ جب اس نوعیت کی اصطلاحات مقامی زبانوں کا حصہ بنتی ہیں، تو یہ صرف لسانی تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک گہری ثقافتی تبدیلی کا اظہار بھی ہوتی ہے۔ جہاں جسم اور شفا کے بارے میں روایتی تصورات یا تو جدید سائنسی بیانیے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں یا رفتہ رفتہ ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یوں یہ اقتباس اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ عالمی اثرات اب ہماری زندگی، صحت اور بقا کے فہم میں کس طرح گہرائی سے پیوست ہو چکے ہیں۔

طاہرہ اقبال کے افسانوں میں یہ امر واضح ہے کہ کس طرح زبان عصرِ حاضر کی دنیا میں ثقافتی تصادم کو اجاگر کرتی ہے۔ کن ٹٹہ، ہٹ پرے، گھم گھم مدھانی، ٹرانسپلانٹیشن، سلیپنگ بیوٹی، سڈن ڈیتھ جیسے الفاظ کا استعمال مقامی اور عالمی ثقافتوں کا باہمی ملاپ کہانیوں کے مواد میں بلہ اس کے لسانی پیرائے میں بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ ان کے افسانوں میں مقامی اور انگریزی الفاظ کا شعوری استعمال مقامی ثقافت اور عالمگیریت کے درمیان پائے جانے والے تناؤ کو نمایاں کرتا ہے، جو سماجی و سیاسی تبدیلی کے پس منظر میں تشکیل پاتی مابعد نوآبادیاتی شناخت کا عکاس ہے۔

اس لسانی طرزِ اظہار سے ہمیں روایت، جدیدیت اور عالمگیریت کے درمیان ایک ثقافتی کشمکش نظر آتی ہے۔ انگریزی اصطلاحات جیسےTransplantation،Sleeping Beauty، Sudden Deathاور دیگر روزمرہ کے الفاظ محض زبان کی سطح پر مستعار الفاظ نہیں، بلکہ ان کے ساتھ مغربی تصورات، استعارے اور بیانیے بھی در آتے ہیں۔ یہ الفاظ علمی، سائنسی اور میڈیا کے عالمی تناظر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ اس کے بالمقابل کن ٹٹہ، ہٹ پرے، گھم گھم مدھانی جیسے الفاظ مقامی ثقافت، محاورے، اور دیہی معاشرت کو بیان کرتے ہیں۔ یہ الفاظ عوامی روایات اور مقامی شعور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مصنفہ کے ہاں دونوں لسانی دنیاؤں کی موجودگی ایک داخلی ثقافتی تضاد کو جنم دیتی ہے۔

طاہرہ اقبال کے افسانوں میں زبان کا بدلتا ہوا مزاج اور اس میں ہائبرڈ (hybrid) عناصر کا استعمال محض فنی تکنیک نہیں بلکہ ایک سوچا سمجھا عمل ہے، جو اس ثقافتی کشمکش کی نمائندگی کرتا ہے۔ جب کسی دیہی یا جذباتی ماحول میں Transplantation جیسے سائنسی لفظ کا استعمال ہوتا ہے، تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالمی جدیدیت مقامی سماج میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ بعض اوقات یہ الفاظ غیر فطری انداز میں کہانی میں داخل ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی یہ موجودہ اقدار و نظریات کی جگہ لے لیتے ہیں۔ Sleeping Beautyاور Sudden Death جیسے عنوانات محض واقعات یا کرداروں کی نمائندگی نہیں کرتے، بلکہ وہ ایک وسیع تر تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کہانی کے ثقافتی بیانیے کو متاثر کرتی ہے۔

اس کے علاوہ، ان افسانوں میں پایا جانے والا لغوی تناؤ ایک وسیع سماجی حقیقت کی بھی عکاسی کرتا ہے، جہاں شہری اور اشرافیہ طبقات تیزی سے عالمی زبان اور ثقافت کو اپناتے ہیں، جبکہ دیہی یا محروم طبقے اپنی مادری زبان اور روایتی شناخت سے وابستہ رہتے

ہیں۔ یہ لسانی تفریق ثقافتی اور شناختی بحران کو جنم دیتی ہے، جسے طاہرہ اقبال نہایت مہارت سے کہانیوں کے ذریعے پیش کرتی ہیں۔ ان کی تحریریں اس بات کا اظہار بن جاتی ہیں کہ زبان صرف رابطے کا ذریعہ نہیں بلکہ شناخت اور ثقافت کا مظہر بھی ہے۔

نتیجتاً، طاہرہ اقبال کے افسانوں میں انگریزی اور مقامی زبان کا امتزاج ایک بامعنی ادبی عمل ہے، جو مقامی اور عالمی ثقافتوں کے درمیان جاری کشمکش کو زبان کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ ان کے الفاظ، بیانیہ تکنیک، اور زبان کی تبدیلی محض فنی انتخاب نہیں بلکہ بین الثقافتی تبدیلی کے اثرات کی ادبی نمائندگی ہیں۔ ان کی کہانیاں اس جدوجہد کا آئینہ ہیں جو شناخت، زبان اور معنی کی سطح پر ایک بدلتی ہوئی دنیا میں جاری ہے، اور یہی پہلو انہیں بین الثقافتی ادب میں ایک نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔

طاہرہ اقبال کے افسانوں میں لسانی تصادم محض اسلوبیاتی یا موضوعاتی انتخاب نہیں بلکہ روایت اور جدیدیت کے مابین جاری تعامل سے جنم لینے والے ایک گہرے ثقافتی رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کے ہاں شعوری طور پر ہائبرڈ الفاظ کا استعمال یعنی انگریزی سائنسی اور میڈیا سے ماخوذ اصطلاحات کو مقامی محاوروں اور تاثرات کے ساتھ ہم آہنگ کرنا، عصری پاکستانی معاشرے میں ابھرتے ہوئے لسانی شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ لسانی امتزاج ایک بیانیہ تناؤ پیدا کرتا ہے جو مقامی ثقافتی اقدار اور عالمی اثرات کے درمیان محصور کرداروں کے اندرونی ثقافتی مخمصوں کو اجاگر کرتا ہے۔ طاہرہ اقبال کے افسانوں کی زبان محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک مکالماتی میدان ہے، جہاں مختلف عالمی نظریات ایک دوسرے سے متصادم ہوتے، گاہے باہم مدغم ہوتے ہیں، اور مابعد نوآبادیاتی و عالمی ثقافتوں کے وسیع تر سماجی و لسانی تناظر کی عکاسی کرتے ہیں۔

تحقیقی نقطۂ نظر سے ان افسانوں کا تجزیہ ادبی تشریحی اور سماجی لسانی طریقہ کار کے امتزاج کے ساتھ مؤثر طور پر ممکن ہے۔ قریبی متنی مطالعہ، موضوعاتی تجزیہ اور گفتگو کی تعبیر و تشریح کے ذریعے ان کہانیوں میں زبان کے انتخاب کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ یہ انتخاب کس طرح شناخت کی تشکیل، ثقافتی ربط اور مزاحمت کی صورتیں پیش کرتا ہے۔ معیاری تحقیقی طریقہ کار کے ذریعے اس امر کی تفہیم کی گئی ہے کہ کس طرح زبان کے ذریعے معنی خلق کیے جاتے ہیں اور لسانی تغیرات کے ردِ عمل میں ثقافتی بیانیے وجود میں آتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ Ahmed, Toqeer. "A Saga of Bilingualism and Belonging: An Analysis of Language Use and Hybrid Identity in The Reluctant Fundamentalist." Pakistan Languages and Humanities Review, vol. 8, no. 2(Special Issue), 2024, p.534–542

۲۔ عبد الستاملک، ڈاکٹر، مضمون: سماجی لسانیات ایک تعارف،، متن، جلد ۴، شمارہ ۲

۳۔ عصمت جاوید، ڈاکٹر، اُردو پر فارسی کے لسانی اثرات۔ تصرف کے آئینے میں، مہاراشٹر پرنٹنگ اسکول، سواشیو پیٹھ۔ پونا

۴۔ طاہرہ اقبال، مس فٹ (ریخت)، دوست پبلیکیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۵۵

۵۔ طاہرہ اقبال، وچولن (ریخت)، دوست پبلیکیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۱

٦۔ ایضاً، ص ۱۴۳

٧۔ ایضاً، ص ۱۴۳

٨۔ ایضاً، ص ۱۴۳

٩۔ طاہرہ اقبال، واکنگ ٹریک (ریخت) دوست پبلیکیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۵

۱۰۔ طاہرہ اقبال، سلیپنگ بیوٹی، (گنجی بار) ورڈ میٹ، اسلام آباد، ص ۲۶۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۳۶

References in Roman Script:

1. Ahmed, Toqeer. "A Saga of Bilingualism and Belonging: An Analysis of Language Use and Hybrid Identity in *The Reluctant Fundamentalist*." *Pakistan Languages and Humanities Review*, vol. 8, no. 2 (Special Issue), 2024, p.534–542.
2. Malik, Abdul Sattar, Dr. "Samaji Lisaniyat: Aik Taaruf." *Matn*, jild 4, shumara 2, 2024, ss. xx–xx.
3. Ismat Javed, Dr, Urdu par Farsi ke lisani asraat: Tasarruf ke aaine mein, Maharashtra Printing School, Swa Shivpeeth, Puna
4. Tahira Iqbal, Misfit (Rekht), Dost Publication, Islamabad, 2010, p.55
5. Tahira Iqbal, Vacholan (Rekht), Dost Publication, Islamabad, 2010, p.141
6. Ibid, p.143
7. Ibid, p.143
8. Ibid, p.143
9. Tahira Iqbal, Walking Track (Rekht), Dost Publication, Islamabad, 2010, p.155
10. Tahira Iqbal, Sleeping Beauty, (Ganji Baar), Word Mate, Islamabad, p.264
11. Ibid, p.236

Dr. Ghazal Yaqub is a Teaching Research Associate in the Urdu Department at International Islamic University, Islamabad, Pakistan. She completed her PhD at IIU Islamabad, specializing in Urdu fiction and prose. Dr.Ghazal has authored one book and published seventeen articles. She was awarded a Gold Medal in her BS program and received the "Faiza Ahmed Faiz Award" for her book.

Dr. Muhammad Amjad earned his PhD in Urdu from the National University of Modern Languages, Islamabad, Pakistan, with a focus on Urdu linguistics. He has published six articles.